ملتِ اسلامیہ کا تصور اور اردو شاعری: ایک تجزیاتی مطالعہ

The Concept of Islamic Nation and Urdu Poetry: An Analytical Study

ڈاکٹر مطاہر شاہ[i] اعجاز الرحمٰن[ii] ڈاکٹر محمد رحمان[iii]

Abstract

Islam is a universal religion. It is a source of guidance for the entire humanity. Its followers are present all over the world and are connected to the rope of "Millat", even when living in different geographical regions and countries. The Islamic concept of nationality and nation completely different from the western concept. In Islam this concept is based on religion as opposed to geography, color, race, etc, the concept of nation is especially prominent in the poetry of Muslims. Along with Arabic, Persian and all regional languages, Urdu also has a rich tradition of national poetry. This article highlights the tradition of "Millī" poetry found in Urdu. Also the difference between "national poetry" and "Millī poetry" has been made clear.

Key Words: Concept of Nations, Nationality, Comprehensive, Spirit, Tradition

تعارف

"ملتؔ" کا لفظ بالعموم قوم کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ عربی زبان میں ملتؔ مذہب اور دین کے معنی بھی دیتا ہے۔ ہندی میں یہ لفظ دھرم، پنتھ، فرقہ، گروہ، راہ و رسم، میل جول اور ملنساری کے معنوں میں آتا ہے۔ جب تمام مطالب یکجا کر لیے جائیں تو مراد ایک ایسا گروہ یا قوم ہے جس کا نصب العین، مراعات اور زندگی کا معیار ایک ہو۔ ایک مذہب اور شریعت کی حامی ہو۔ اگر ان معنوں کو سامنے رکھ کر ادیانِ عالم یا اقوامِ عالم پر ناقدانہ نگاہ ڈالی جائے تو سوائے مسلمان قوم کے دوسری کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جس پر لفظ "ملتؔ" کا اطلاق ہو سکے۔

عیسائیت یا یہودیت میں تثلیث پرستی نے ملتؔ کا رجحان پہلے سے ہی ختم کر دیا ہے کیونکہ ان قوموں کے عقائد میں

---

i اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

ii ایم-فل سکالر، ڈیپارٹمنٹ آف اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

iii اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

معبود ایک نہیں۔ اگر ہندو مت کو دیکھا جائے تو ذات پات نے جذبۂ ملت کو مجروح کر رکھا ہے۔ دیگر اقوام میں بھی اسی طرح واحد اور مرکزی نقطہ موجود نہیں جس پر مجتمع ہو کر وہ قوم ملت کا درجہ حاصل کرے۔ اس صورت میں واحد مسلمان قوم ہے جس کے پاس مرکزِ اتصال خدائے وحدہ لاشریک کا کلمہ لاالٰہ الااللہ ہے جو قوم کے امیر غریب، ادنیٰ اعلیٰ، آقا غلام، بادشاہ فقیر سب کو ایک نقطے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس ایک مرکز پر پہنچ کر قوم میں وہ وحدت وجود پاتی ہے جو اسے قوم سے ملت تک کے درجے میں پہنچا دیتی ہے۔

اس ضمن میں قرآن مجید برہان قاطع پیش کرتا ہے کہ اس میں جہاں بھی لفظ 'ملت' لایا ہے اس سے مراد ملتِ اسلامیہ ہے۔ جو اسلام کا حامی نہیں اس کے لیے "مشرکین" یا "کافرین" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یہ وہ دو قومی نظریہ ہے جو ازل سے وجود پاتا ہے۔ ایک وہ مذہب اور شریعت ہے جو ربِ کائنات نے انسان کے لیے پسند کیا اور جسے انبیا علیہم السلام کے ذریعے وقتاً فوقتاً دنیا میں اتارتا رہا۔ جن لوگوں نے وقت کے پیغمبر کے لائے ہوئے دین کو قبول کیا وہ ملت کے اندر آ گیا اور جس نے انکار کیا وہ مشرکین یا منکرین کی صف میں داخل ہو گیا۔ یہی دو معیار ازل سے موجود ہیں جو دو قومی نظریہ کی بنیاد ہیں، یعنی دنیا میں مسلمان اور کافر دو جدا جدا قومیں آباد ہیں۔ بقول ڈاکٹر ارشاد شاکر:

> "اس جماعت کا دینیاتی نام ملت ہے جو از روئے تاریخ جامع الشرائع رسول امی صلعم کو مرکزِ اتصال بنانے سے عبارت ہے اس کا روحانی اتصال توحید باری ہے۔[1]"

تو ثابت ہوا کہ ملت وہ قوم ہے جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کی پیروی، حضرت محمد صلعم کے طریقے کے مطابق کرتی ہے جسے شریعت میں "سنت" کہا جاتا ہے۔

مغربی تصورِ قومیت اور اسلامی تصورِ ملت میں واضح فرق یہی ہے کہ مغربی تصورِ قومیت کے مطابق قوم وطن، رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود سے تشکیل پاتی ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو مغرب میں آفاقی نظامِ قومیت کو وجود بخشنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تصورِ ملت میں جغرافیائی حدود و قیود اور رنگ و نسل کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس تصور کی بنیاد مذہب ہے۔ دنیا کے جس کونے پر بھی مذہبِ اسلام کا حامی شخص ہو گا، وہ ملت کا حصہ ہے۔ ان دونوں تصورات کو سامنے رکھیں تو مذہب اور وطن کے درمیان جو چپقلش نظر آتی ہے وہ مغربی تصورِ وطنیت اور اسلامی تصورِ قومیت کی مناظراتی صورت ہے۔ البتہ اسلامی تاریخ یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ مذہب کو وطن پر فوقیت حاصل ہے۔ اگر وطن کے تحفظ میں مذہب کا

خون ہو رہا ہے تو بحیثیتِ قومِ اسلام مذہب کو بچانا فرض ہے نہ کہ وطن کو۔ اس حوالے سے مسعود قریشی یوں رقمطراز ہیں:

"اسلام نے وطن کو خدا نہیں بننے دیا۔ اس کے قدموں میں انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی بھینٹ نہیں چڑھائی۔ بدلتی جغرافیائی حدود کو نہ بدلنے والے دینی اصولوں سے بلند تر تسلیم نہیں کیا۔ دونوں میں تصادم کا مقام آ جائے تو افضل دینی اصول ہیں یہاں تک کہ ان کی حفاظت کے لیے ترکِ وطن کا حکم دیا اور ہجرت سنت ٹھہری[2]۔"

اب سوال یہ ہے کہ ادیانِ عالم میں کس دین کو صحیح مان کر اس پر عمل کیا جائے تاکہ ملت کا منصب حاصل ہو سکے؟ اس ضمن میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَام[3]

اب کوئی دلیل آ ہی نہیں سکتی جو اسے رد کر سکے۔ تو ثابت ہوا کہ ملت وہ قوم ہے جو جغرافیائی حدود اور رنگ و خون کے نسلی امتیازات سے پاک مذہبِ اسلام کے روشن اصولوں پر زندگی بسر کر رہی ہو۔ اس قوم سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کو ملت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہاں دو رجحانات مزید سامنے آتے ہیں۔ 'قوم' اور 'ملت'۔ لفظ قوم کے اندر جغرافیہ اور مذہب دونوں تصور آ سکتے ہیں۔ مگر ملت کے اندر صرف مذہب کا تصور ہی آ سکتا ہے، جغرافیہ یکسر مٹ جاتا ہے۔

کسی قوم کے خد و خال کا جائزہ لینا ہو تو پہلے اس قوم کے مذہبی عقائد اور بعد ازاں اس کے ادب پر نظر جاتی ہے۔ ادب کسی قوم کے نظریات و عقائد کا امین ہوتا ہے۔ شاعری ہو یا نثر دونوں صورتوں میں اس قوم کی روح دکھائی دیتی ہے۔ نثری ادب کے ساتھ ساتھ شاعری نے بھی زندگی اور معاشرت کے حوالے سے تمام تر موضوعات کو دامن میں سمیٹا ہے۔ خالصتاً اردو شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو اردو زبان خوش نصیب رہی ہے کہ آغاز سے ہی اس نے زندگی کو بنیاد بنا کر اس کے متعلق موضوعات کو اپنے دامن میں لانا شروع کر دیا۔ کبھی اس کی نظر ملکی سرحدوں پر پہنچی تو کبھی مذہبی اقدار و روایات پر لب کشا ہوئی۔ یہ دونوں نقطے مل کر شاعری کا ایک نیا موضوع بنانے میں کامیاب ہوئے جسے "ملی شاعری" کہتے ہیں۔

ملی شاعری دراصل وہ شاعری ہے جو مسلم قوم یا ملت کے لیے کی گئی ہو۔ قومی شاعری کے متعلق انور جمال لکھتے ہیں:

"قومی شاعری ایسی شاعری کو کہتے ہیں جس کا بنیادی موضوع اپنی قوم ہو[4]۔"

اس بیانیے میں اپنی قوم ایک ایسا اشارہ ہے جو ملی شاعری میں ایک متنازع حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی قوم سے مراد ہندو قوم، عیسائی قوم، یہودی قوم اور دیگر بھی کوئی قوم ہو سکتی ہے۔ لیکن ملی شاعری میں مسلمان قوم کے سوا کوئی دوسری قوم نہیں آ سکتی۔

اردو شاعری میں ایسے حوالے بکثرت ملتے ہیں جو قومی و ملی دونوں رجحانات میں فرق واضح کر سکتے ہیں۔ بقول اقبال:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا[5]

اس شعر میں جس قوم کا ذکر آتا ہے وہ مسلمان، ہندو، سکھ اور ہر وہ قوم ہے جو ہندوستان کے جغرافیے کے اندر رہتی ہے۔ اس کے برعکس ایک اور شعر دیکھیے:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہے، سارا جہاں ہمارا[6]

بالا شعر خالصتاً ملی شاعری کا حوالہ ہے۔ اس میں جغرافیائی حدیں مٹ رہی ہیں اور دنیائے دوں میں موجود مسلمانوں کو جمع کر کے ایک قوم شمار کیا ہے۔ پہلا شعر قومی شاعری اور دوسرا شعر خالصتاً ملی شاعری کا حوالہ ہے۔

ملی شاعری سے مراد ایسی شاعری لی جاسکتی ہے جس میں مسلمانوں کو متحد اور متصل کرنے کے موضوعات پائے جائیں۔ مسلمان قوم چونکہ مذہب کو مقتدر جان کر اپنی تمام تر حرکات و سکنات مذہب کے تابع کر دیتی ہے۔ اس لیے اس قوم میں جو میل جول، راہ و رسم، اتحاد و اتفاق، اخوت و بھائی چارے جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں وہ اس قوم کو ملت کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ جب یہ اوصاف مٹنے لگیں اور جذبۂ ملت کمزور پڑنے لگ جائے تو قوم کے باشعور لوگ ان خصوصات کو نئے سرے سے پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلعم وجہِ اتصالِ ملت ہیں اور کلمہ طیبہ مرکز اتصال ملت۔ کلمے کا پیغام اور سنت نبوی صلعم کا احیا ملت کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ ان دونوں رجحانات کو یکجا کر کے ایک مرکزی حیثیت دینا اور پھر پوری قوم کو اس مرکز پر جمع ہونے کا درس شاعری میں دینا ملی شاعری ہے۔

ملی شاعری کی سرحدیں ایک طرف قومی شاعری سے جڑتی ہیں تو دوسری طرف مذہبی شاعری یا دینی ادب سے ملتی ہیں۔ دینی شاعری اور ملی شاعری میں باہم اتصال تو نظر آتا ہے مگر دونوں میں واضح فرق موجود ہے۔ دینی شاعری میں مذہبِ اسلام کے جملہ امور کو سامنے لا کر مسلمانوں کو ان امور پر کاربند بنایا جاتا ہے۔ یہاں انفرادیت کسی حد تک نمایاں ہے کہ جو شخص اس پر عمل کرے تو انفرادی طور پر وہ اپنے افعال و اعمال کو درست کر سکتا ہے۔ اس کی اپنی جگہ مسلمہ اہمیت موجود ہے۔ دوسری طرف ملی شاعری نہ صرف انفرادی کردار کو بہتر بنانے کا درس دیتی ہے بلکہ اجتماعی سطح پر قوم و ملت پر اپنے

اثرات مرتب کر کے بحیثیت مجموعی قوم میں اتفاق و اتحاد اور اخوت و بھائی چارے کا جذبہ قائم کرتی ہے۔ ملی شاعری کے حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے بڑے پتے کی رائے قائم کی ہے:

"ملی شاعری سے مراد وہی شاعری ہے جس کا محرک درد ملت اور جس کا مقصد ملتِ اسلامیہ کی عظمت رفتہ کا احیا ہو[7]۔"

تو ثابت ہوا کہ اسلامی ادب اور ملی ادب میں واضح فرق ہے اور وہ یہ کہ ایک میں انفرادی کردار سازی اور دوسرے میں بحیثیتِ قوم اجتماعی سطح پر کردار سازی کی جدوجہد کی جاتی ہے۔ جس سے قوم اسلام اپنی شان رفتہ دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔

اردو شاعری کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو آغاز سے ہی یہاں ایسے اثرات موجود تھے جو ملی موضوع کا سنگِ بنیاد ثابت ہو سکتے تھے۔ صوفیا کرام کی شاعری نے مذہبی اصطلاحات اور اقدار و روایات کو شاعری میں جگہ دینی شروع کر دی تھی۔ اسلامی تصورات روزِ ازل سے ہی اردو شاعری کا موضوع بنتے گئے۔ بقول انور سدید:

"سترھویں صدی کے وسط میں برصغیر کے مسلمانوں نے اس زبان میں تخلیقی اظہار شروع کر دیا تھا چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ اردو زبان و ادب میں اسلامی تحریک روزِ ازل سے جاری ہے[8]۔"

اردو شاعری کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بہت بعد میں ہوا۔ چونکہ مسلمان بحیثیتِ فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اس لیے عرصہ دراز تک یہ فکر لاحق نہ تھی کہ مسلمان قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ مسلمان قوم ایک طویل عرصے تک متحد تھی اور خوشی و خوشحالی نے توجہ اس طرف مبذول نہیں کروائی۔ علما اور صوفیا رشد و ہدایت کے سلسلے میں مذہبی احکامات اور اقدار و روایات کی نشر و اشاعت میں ہی مصروف رہے۔ جب اس حاکم قوم پر زوال آیا اور محکومیت کے پنجے میں دبوچی گئی تو اس کے اتحاد میں دراڑیں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ جب مسلمانوں کے ہاتھ باگِ حکومت سنبھالنے سے عاجز آ گئے تو انگریزوں نے رخشِ حکومت کی باگ سنبھال لی۔ اس طرح سریرِ ہند مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گیا۔ ہندوستان میں اب تین طرح کے رجحانات ابل پڑے۔ ایک طرف ہندو اپنے آپ کو ہندوستان کا وارث ٹھہرانے لگے۔ دوسری طرف مسلمان اپنی حکومت کا حوالہ دے رہے تھے کہ ہندوستان ہمارا ہے۔ انگریز بزورِ شمشیر ہندوستان کو اپنے قدموں میں لا چکا تھا اور حقداری کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اس نازک صورتحال میں حکومتِ وقت کے آگے سر جھکانا شاید وقت کا تقاضا تھا۔ ہندو اس ضمن میں بڑے ہی شاتر دماغ ثابت ہوئے اور جنگِ آزادی کا سارا نزلہ مسلمانوں کے سر گرانے میں کامیاب ہو گئے۔

اب انگریزوں کا دشمن ہندوستان میں مسلمان ہی تھا۔ ایک طرف دشمنی کی وجہ مذہب تھا جو مسلمانوں کو انگریزوں سے پردے میں رکھتا تھا اور دوسری طرف حکومتی رقابت بھی تھی۔ اس رقابت کی آگ میں زیادہ تپش تھی اس لیے انگریزوں نے کتابِ ملتِ اسلامیہ کو ہندوستان میں پھاڑ کر اس کا صفحہ صفحہ بکھیر کر رکھ دیا۔ اب یہ وقت کا تقاضا اور معاشرتی پکار بن چکی تھی کہ ایک ایسی فکر سامنے آئے جو اس قوم کو دوبارہ یکجا ہونے میں معاون ثابت ہو سکے۔ سیاسی طور پر مسلمان اس قدر مستحکم تھے ہی نہیں کہ وہ ایک پلیٹ فام پر جمع ہو سکتے۔ اس افراتفری میں جہاں انگریزوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کی وہیں مسلمانوں کو عتاب کا نشانہ بنایا۔ ڈاکٹر شارب ردولوی ایک جگہ انگریز مصنف ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "حکومت نے مسلمانوں پر سارے دروازے بند کر دیے تھے۔ قاضیوں کو برطرف کر دیا تھا۔ ان کا تعلیمی نظام ختم ہو گیا تھا۔ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ سرکاری ملازمتوں اور دوسرے پیشوں سے مسلمان غائب ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو وکالت کا لائسنس بھی نہیں ملتا تھا[9]۔"

اس سیاسی صورتحال کو مدِ نظر رکھ کر یہ کہنا بجا ہے کہ یہ اس عہد کی عام آواز تھی کہ ایسا ادب منظرِ عام پر آئے جو مسلمانوں کو معاشرتی اور اخلاقی ظلم سے نجات دلا سکے۔ ایسی نازک صورتحال میں سر سید احمد خان جیسی نابغہ شخصیت نے میدان عمل میں قدم رکھا اور مسلمانوں کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سہارا دینا شروع کیا۔

سر سید احمد خان وہ سوچ اور فکر لے کر اس میدان میں آئے جس نے بیک وقت تین محاذوں پر مسلمانوں کا دفاع کیا۔ تعلیمی، سیاسی، اور مذہبی محاذوں پر مجاہد بن کر کھڑے ہوئے۔ سیاسی میدان میں سر سید نے مسلمانوں کو متحد کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس غرض سے انھوں نے ایک تحریک چلائی جسے 'علی گڑھ تحریک' یا 'سر سید تحریک' کہا جاتا ہے۔ سر سید نے اس تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو آمادہ بر عمل کیا۔ اس مقصد میں سر سید نے چند رفقائے کار کو ساتھ ملایا اور کامیابی کی راہیں طے کرنی شروع کر دیں۔ قومی خدمت کے اس جذبے کو مزید جلا بخشنے کے لیے قلم کا سہارا لیا اور مسلمان قوم کی ترجمانی شروع کر دی۔ پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر ان کی خدمات کے یوں معترف ہیں:

> "جن اصناف میں خود طبع آزمائی نہ کر سکے، احباب کو ان کی طرف راغب کیا معاصر تخلیق کاروں اور بالخصوص شعرا کو قومی و ملی مسائل کا احساس کرانے کی کوشش کی۔ حالی سے مسدس لکھوائی اور اسے باعثِ ثواب جانا[10]۔"

ڈاکٹر سلیم اختر کی اس ناقدانہ رائے سے واضح ہوتا ہے کہ ملی شعور نے اولاً سر سید کے دماغ میں پنپنا شروع کیا۔ پھر یہی اثر ان کے رفقا میں ترسیل کر گیا اور ایک دھارا بن کر دنیائے شاعری میں ابھرا جس کی پہلی اینٹ مولانا حالی کی نظم 'مد و جزرِ اسلام'

المعروف 'مسدسِ حالیؔ' ثابت ہوئی۔

مولانا حالیؔ سرسید کے خاص ساتھیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے سرسید کی ایما پر نظم لکھی، جو کہ منظوم تاریخ اسلام کہلائی جاسکتی ہے۔ یہ نظم اردو میں ملی شاعری کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ سرسید احمد خان چونکہ شاعر نہ تھے اس لیے ملی شاعری میں ان کا نام نہیں آسکتا۔ اگر وہ شاعر ہوتے تو لازماً اس موضوع کا آغاز ان سے ہوتا۔

البتہ اردو ملی شاعری کا پہلا نمونہ حالیؔ کی مسدس ہے جس میں قوم کا عروج اور پھر زوال بڑے ہی دردمند اور پُر تاثیر انداز میں پیش کرتے ہوئے حالیؔ نے مسلمانانِ ہند کو پھر سے اس راستے پر لانے کی عظیم کوشش کی ہے جو انہیں غلامی سے نکال سکتا تھا۔ ڈاکٹر شارب ردولوی مسدس حالی کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

"مسلمانوں کی بیداری کے سلسلے میں اگر ایک طرف علی گڑھ کالج سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے تو دوسری طرف مسدس حالی کا نام آتا ہے[11]۔"

اس نظم میں مولانا الطاف حسین حالیؔ شاعر کم، طبیب زیادہ لگتے ہیں جو ملتِ اسلامیہ میں وہ بیماریاں تلاش کرتے ہیں جنہوں نے اسے نزع کی حالت تک پہنچایا تھا اور پھر ان بیماریوں کا علاج بھی بتاتے ہیں۔ بلاشبہ سرسید کی گفتگو کا اثر حالیؔ نے قبول کیا اور مسدس لکھ ڈالی۔ مسدس نے مولانا حالیؔ کو مفکرِ اسلام تسلیم کروایا۔ مسدس حالیؔ میں اول تا آخر ملتِ اسلامیہ کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ مسدس میں حالیؔ کہتے ہیں:

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت رہی ہے نہ ہر گز رہے گی سلامت
جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت نہ شخصی بزرگی نہ شخصی حکومت
وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی ہری ہوگی جڑ اس گلستاں میں جس کی[12]

اس بند میں دیکھا جائے تو جماعت بحیثیت قوم سب کی اجتماعی حالت ہے اور گلستان وہ مذہب ہے جس کے اندر مسلمان زندگی بسر کر رہے ہیں۔ الغرض مسدسِ حالی ملی شاعری کا پہلا نمونہ اور حالی پہلے ملی شاعر ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ کے بعد اسی عہد میں دوسرے بڑے شاعر مولانا شبلی نعمانیؔ سامنے آتے ہیں۔ مولانا شبلیؔ نعمانی کا بڑا کارنامہ 'سیرت النبیؐ' ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سرسید احمد خان کے اثر کو قبول کرتے ہوئے اپنی شاعری میں ملت جیسے عظیم موضوع کو جگہ دی۔ پہلے پہل وہ سرسید تحریک کے حامی تھے مگر بعد میں انگریزوں سے نفرت اور سرسید کی انگریز دوستی نے شبلیؔ کو سرسید تحریک سے جدا ہونے پر مجبور کیا۔ بہ ایں ہمہ وہ اپنے نقطہ نظر سے پیچھے نہ ہٹے۔ یہ صرف سرسید

ہی کی آواز نہ تھی بلکہ اس عہد کی آواز تھی کہ شاعری میں ایسے افکار سموئے جائیں۔ لہٰذا سر سید سے دور رہ کر بھی شبلیؔ نے یہ فریضہ بڑے احسن طریقے سے انجام دیا۔

مولانا شبلیؔ نعمانی مذہب کو زندگی کا جزوِ اعظم تسلیم کرتے تھے۔ انگریز سے سخت دشمنی رکھتے تھے۔ ان کی نظمیں 'صبحِ اُمید' اور 'شہر آشوبِ اسلام' اردو ملی شاعری کی بہترین مثالیں ہیں۔ سر سید اور شبلیؔ کا مقصد ایک تھا تاہم اس مقصد کو پانے کے لیے سر سید آنے والے وقت پہ نظر جمائے تھے اور شبلیؔ ماضی کی طرف بار بار جھانک رہے تھے۔ قدامت پسندی اور جدیدیت دو ایسے رجحان تھے جنہوں نے شبلیؔ کو سر سید سے جدا کر کے ندوۃ العلما اور دار المصنفین کا جزو بنا دیا۔ ملی شاعری کے حوالے سے شبلیؔ کے دو شعر:

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک [13]

ان شعروں میں شبلیؔ نعمانی کا ملی درد بالکل واضح ہے۔ یہ اس دور کی معاشرتی صورتحال ہے جو شبلیؔ کو سر سید تحریک سے دور رکھ کر بھی ملی جذبے سے سرشار رکھتی ہے۔

اردو ملی شاعری کی تاریخ میں اس دور کی ایک قد آور شخصیت 'اکبرؔ الہ آبادی' ہیں۔ اکبرؔ نے سر سید کی تحریک سے یکسر احتراز برتا اور اپنے طنز کے تیر اس تحریک پر بھی چلاتے رہے۔ اکبرؔ الہ آبادی کا نام مزاحیہ شاعری کے ضمن میں زیادہ مشہور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس عہد کے ترجمانِ ملت تھے۔ ان کے سینے میں قومی درد تھا۔ اکبرؔ کی رباعیات اور قطعات میں ملی درد واضح ہے۔ وہ قوم کو نئے سرے سے یکجا کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے انہوں نے بھرپور طنز سے بھی کام لیا ہے۔ ایک جگہ درد بھرے لہجے میں وہ پوری قوم پر طنز کا نشتر چلاتے ہوئے ان کی دردمندی دیکھیے:

کٹی رگِ اتحادِ ملت، رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی، نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں [14]

اکبر الہ آبادی کے دور کے ساتھ متصل دور میں اردو ملی شاعری کی روایت آگے بڑھانے اور اس آسمان کا روشن ستارا بننے والی نابغہ روزگار شخصیت 'علامہ محمد اقبال' ہیں۔ اقبال کی شاعری ابتدا تا آخر ملتِ اسلامیہ کی تشکیل نو اور جذبۂ ملت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اقبال نے فقط مسلمانوں کو اتحاد کا درس نہیں دیا بلکہ ملت کی بقا اور احیا کے لیے تمام رموز و علائم اور کارفرما اصولوں کو بھی واضح کر دیا۔ علامہ اقبال کے دور میں ملت کا شیرازہ نئے سرے سے یکجا ہو رہا تھا جس کی مثال ان کی نظم "طلوعِ اسلام"

میں ملتی ہے مگر عالمِ اسلام میں وہ اتحاد قائم نہیں تھا جو اقبال چاہتے تھے۔ لہٰذا ملت ان کا شعری موضوع بنی۔ اقبال خود کہتے ہیں:

"میرا مقصد کچھ شاعری نہیں بلکہ غائت یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ احساسِ ملّیہ پیدا ہوں جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا خاصا تھا[15]۔"

علامہ اقبال کی شاعری میں اگر بڑا موضوع ہے تو وہ ملت ہے جس کے احیا کے لیے وہ کبھی جذباتی ہوتے ہیں، کبھی آنسو بہاتے ہیں، کبھی پُر امید ہوتے ہیں اور کبھی مبلغ بن جاتے ہیں۔ البتہ ملت کا موضوع اس شعر ہیں صاف نظر آتا ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر[16]

بعد از اقبال اگر اس روایت میں کوئی شاعر ہیں تو وہ ظفر ہیں جو شاعر اور صحافی کی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ بلا شبہ مولانا ظفر علی خان اردو ملی شاعری کی آخری منزل کہلائے جا سکتے ہیں۔ روسی انقلاب کے اثر سے چلنے والی ترقی پسند تحریک نے اگرچہ ملی شاعری کو سیاسی موضوع دے کر سیاست زدہ کر دیا تھا تاہم مولانا ظفر علی خان کے ہاں سیاست اور ملت کے موضوعات بیک وقت آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ملت کے باہم متصل رہنے کے خواہاں ہیں اور ملت کے درمیان تفرقہ بازی کو جانتے بھی ہیں۔ اس کی مثال ان کی ایک نظم "انجمن اتحادِ ملت" میں بخوبی ملتی ہے۔ ان کے ہاں ملی شاعری کی مثال یوں دیکھی جاسکتی ہے:

ہند میں ملت کو جو پیش آتی ہیں دشواریاں
باعث ان کا ہیں خود اپنی ہی غلط کرداریاں
جا ملے باطل پرستوں سے پرستارانِ حق
پیشوائی کو نکل آئیں نہ پھر کیوں خواریاں[17]

بیسویں صدی میں ترقی پسندی کے خلاف 'تحریکِ ادبِ اسلامی' سامنے آئی۔ اس کا نصب العین شاعری میں اسلام کا پرچار تھا۔ یہ تحریک خودرو نہ تھی۔ وقت کے تقاضوں کے عین مطابق نہ ہونے کے باعث یہ زیادہ پھل پھول نہ سکی۔ ملی شاعری کی آخری منزل مولانا ظفر علی خان ہی ہیں۔ تحریکِ ادبِ اسلامی کے متعلق انور سدید یوں لکھتے ہیں:

"اس تحریک نے طغیان و تحرک پیدا کرنے کے لیے رجز خوانی کا انداز اختیار کیا اور اقبال کے الفاظ، اصوات اور اسالیب کی جامع تقلید کی۔ تاہم وہ تحرک اور جوش جو اقبال کی شاعری کے داخل میں موجزن ہے اس تحریک کے شعرا میں پیدا نہ ہو سکا[18]۔"

خلاصہ

اس طرح آزادی کے بعد کی یہ اسلامی ادب کی تحریک آفاقی صورت نہ اپنا سکی۔ اس کے بعد ملی موضوع جغرافیے کے اندر قید ہو گیا چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہے کہ اردو میں ملی شاعری کی آخری منزل مولانا ظفر علی خان ہیں۔ بعد میں آنے والے شعرا نے قومی نظمیں ضرور لکھیں لیکن وہ رنگ نہ جم سکا جس کی واضح منازل حالیؒ، شبلیؒ، اکبرؒ، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان تھے۔ نئے دور میں ہماری شاعری سیاسی پروپیگنڈا بن گئی اور قوم کا یہ اہم موضوع جغرافیے کی حدوں میں قید ہو گیا۔

حواشی و حوالہ جات

1 پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، حکیم الامت- اقبال (تجدید و احیائے ملت کے تین معرکے) (فیصل آباد: عمار پبلی کیشنز، 2014ء) ص 91

2 مسعود قریشی، وحدتِ افکار، مشمولہ وحدتِ افکار (اسلام آباد: محکمہ فلم و مطبوعات وزارتِ اطلاعات و نشریات (س ن) ص 9

3 سورۃ مریم 19: 3

4 انور جمال، ادبی اصطلاحات (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 1993ء) ص 88

5 علامہ محمد اقبال اقبال، کلیات اقبال (اسلام آباد، سعید بک ڈپو، 1990ء) ص 102

6 نفس مصدر: 197

7 حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1984ء) ص 187

8 انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، 2013ء) ص 549

9 شارب ردولوی، ڈاکٹر، جدید اُردو تنقید-اصول و نظریات (لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی، 1987ء) ص 138

10 سلیم اختر، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر- تنقیدی و تحقیقی مقالات (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2006ء) ص 139

11 جدید اُردو تنقید-اصول و نظریات: 138

12 مولانا حالیؒ، الطاف حسین مسدسِ حالی (لاہور: بک ٹاک، 2008ء) ص 151

13 شبلی نعمانیؒ، کلیاتِ شبلی (اردو) (لاہور: داتا پبلشرز (س-ن)) ص 57

14 علامہ اقبال، کلیاتِ مکاتیبِ اقبالؒ، مرتبہ سید مظفر حسین برنی (دہلی: اردو اکادمی، 1993ء) 1: 226

15 سید اکبر حسین، کلیاتِ اکبر (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 1993ء) ص 131

16 کلیات اقبال: 316

17 مولانا ظفر علی خان، چمنستان (لاہور: پبلشرز یونائیٹڈ، 1944ء) ص 10

18 اردو ادب کی تحریکیں: 554